دی اور کہا "منٹو صاحب اب "ٹھنڈا گوشت" عنایت فرما دیجئے۔ میں "نمرود کی خدائی" میں شامل کروں۔"

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب آفیسر کیڈٹ مظہر علی خاں کا خط موصول ہوا۔

مجھے امید ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دوکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت" سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارکباد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارک باد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔

سنا ہے چودھری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھوک کرتے رہتے تھے۔ اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن دنیا میں سر پھروں کی کمی نہیں۔ کوئی اور صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔"

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھال لے گا تو میں کہوں گا ——

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

سعادت حسن منٹو

لاہور۔ ۲۹ اگست ۱۹۵۰ء

Urdū ke bihtarīn afsāne — Manṭo, ʿIṣmat, ʿAbbās
Prakāsh Pandit, ed
New Delhi: Indian Academy, n.d.

سعادت حسن منٹو

عصمت چغتائی اور میں

●

اُن دنوں جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ بات کیا ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دو ہستیاں مل جائیں تو کتنا اچھا ہوتا —— مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو ....."

انھیں دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں تھا —— وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔

"آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی ——؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط۔ لیکن جب عصمت بمبئی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا۔

"کیا منٹو کنوارہ ہے؟" تو اس نے ذرا غصہ کے ساتھ جواب دیا۔

"جی نہیں!" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں

ایک صرف حیدرآباد ہی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکرمند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں۔ اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ "اگر" بھی کچھ اس قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارھواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطنی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی، تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے، کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا ایک نادر سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر اُن کے دستخط اُن کے قلم کی آخری تحریر ہوتی۔ لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرینِ قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا ——؟"

"تمھارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا —— تمھاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی۔"

"حد ہو گئی ہے۔ لو اب سُنو! میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے۔ ——"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے ——"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں ——؟"

"تم سپاٹ کا مطلب سمجھتے ہو ——؟"

"جی نہیں!"

"سپاٹ ماتھا تمھارا ہے —— قاضی جی کا ماتھا تو ....."

"بڑا خوبصورت ہے ——؟"

"خوبصورت تو ہے ——"

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔"

"چڑا تم رہے ہو مجھے۔"

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے۔"

"تمھیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

"اجی واہ —— ! تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔"

"قاضی صاحب، میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا ——

—— اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے ——"

"قاضی صاحب میں اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی —— اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا پسند ہے۔"

کرشن چندر "چوٹیں" کے دیباچہ میں لکھتا ہے:-

"سمت کو چھپانے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں مبدّل کر دینے کی صفت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار اُن کے حریف ہیں۔"

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں مسرت کی بجائے ایک بہت بڑے قہقہہ میں تبدیل ہو جاتا ــــ عصمت اور منٹو، نکاح اور شادی۔ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے:۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس، عسکری یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ، ان میں سے چور پتا کون سا ہے؟ ــــ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء، عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے پچلے ہونٹ کا سیاہ تل، عباس کی کھوئی کھوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے، کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو، سب ایک ساتھ مل کر پکے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے۔ اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔ (چوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے:۔

میں صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو ــــ زندگی میں صرف ایک عورت؟ اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے ــــ؟ کیوں اس میں اتنے

تماشے جمع ہیں ــــ؟ صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا ــــ میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے۔ مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا۔ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نراتن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی بازار میں اسے ردی کے بھاؤ بیچے ــــ میں اپنی کتاب حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں، تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو۔ میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں" (تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سرا مل جاتا، کھینچنے پر جو ــــ کھنچتا ہی چلا آتا، اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی، اور منٹو اگر اپنی کتاب حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی۔ اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق کا بھس بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے:۔

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں، یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں ایک

قرض تھا۔ جو سُود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کونسا افسانہ پڑھا تھا، مجھے بالکل یاد نہیں۔ یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظہ کو بہت کھُرچا۔ لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑتا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی۔

اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ بمبئی کے ۷ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر جن میں گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے۔ اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریکِ آزادی رہا۔ اس کے بعد رُخ بدلا۔ اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جبکہ میں آلِ انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ ادبِ لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے، میں نے کرشن چندر سے کہا تھا۔

"افسانہ بہت اچھا ہے، لیکن آخری جملہ بہت ہی غیر صناعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ میں ایڈیٹر ہوتا تو اُسے یقیناً حذف کر دیتا۔" چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا۔ "آپ کا افسانہ لحاف مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا۔"

عصمت نے کہا۔ "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا۔ جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شئے کا نام سُن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت نا امیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا ـــــ جب

عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا۔

"یہ تو کمبخت بالکل عورت نکلی ـــــ"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا تھا۔ "عصمت سے ملا تمھیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مرزہ تو بالکل کرکرا ہو گیا۔ لیکن تم اُسے یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے جب اس سے "لحاف" کے آخری فقرے کا ذکر کیا تو نالائق اُس کا تصوّر کرتے ہی جھینپ گئی۔"

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اُس پہلے ردِّ عمل پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی ہی حدود میں رہنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے؟ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھُنس کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اُتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی۔ پولستانی موسیقار شوپیں سے لہُو تھکوا تھکوا کر اس نے لعلِ گوہر ضرور پیدا کرائے۔ لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھُٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے۔ پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے، لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہئے۔ اس کی بانہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہئے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا۔ "یہ تو کمبخت بالکل عورت نکلی ـــــ"

میری بیوی نے "لحاف" پڑھا تو عصمت سے کہا۔ "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے۔"

"بکو نہیں۔ لاؤ وہ برف کہاں ہے۔؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے، بالکل بچّوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں میں کٹاکٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیئے پر کاپی کھلی ہے۔ ایک ہاتھ میں فاؤنٹن پن ہے

اور دوسرے ہاتھ میں برنت کی ٹلی۔ ریڈیو اونچے سُروں میں چلّا رہا ہے مگر اس کا قلم اور منھ دونوں کھٹاکھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گذر جاتے ہیں۔ پر جب دورا پڑا تو سینکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جاتے گا۔ اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے، باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ سبزی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ چوپٹ ہو جاتے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت عجلت ہے، اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی شنکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے۔ اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہو گی ــــــ لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچّی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کر جاتا ہے۔ لیکن ننھّی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تُلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اُف رے بچّے" میں عصمت لکھتی ہے :۔

"گھر کیا ہے محلہ کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آتے۔ دنیا کے بچّے پٹاپٹ مریں، مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جاتے۔ ہر سال ماشاءاللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے ــــــ سنتے ہیں دُنیا میں بچّے بھی مرا کرتے ہیں۔ مرتے

ہوں گے۔ کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں جب اس کی بچّی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچّوں کی سی۔ زندگی کے کسی نظریئے کو فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کریگی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اُٹھائے گی ــــــ صعوبتیں برداشت کرے گی ــــــ مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے ــــــ جس کے ذریعے سے وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا کر اُن کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ــــــ اس کی ہر بات نرالی ہے۔

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بُری طرح مُبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چُومنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکانا ہو گا۔ تو ایسی دُھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے۔ عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اُڑ جانے والی طبیعت کے پیشِ نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سینکڑوں لڑائیاں ہوتیں، مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار تلخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونوں ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا۔

"منٹو تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی۔ میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے "دست درازی" استعمال کیا۔ میں نے جھٹ سے کہا۔

"صحیح لفظ "دراز دستی" ہے۔"

تین بج گئے، عصمت نے اتنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی ــــــ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہ تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی موجود تھے۔ شاہد نے کہا۔

"عصمت اب تمہیں ماننا ہی پڑے گا ــــــ"

اب میاں بیوی میں بحث شروع ہو گئی۔ مرغ اذان دینے لگا ــــــ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور کہا۔

"جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ "دست درازی" ہو گا۔ یہ کیا ہوا دراز دستی۔ دراز دستی۔"

کج بحثی کا یہ سلسلہ دراز بہرحال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ لڑے بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اس کا کوئی موقعہ ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب کبھی کوئی خطرناک موڑ آیا، یا تو عصمت نے رخ بدل لیا، یا میں راستہ کاٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں، وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو" ــــــ تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت

دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دلفریب تو نہیں لیکن دلنشیں ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی گوٹ کی سفید دھوتی۔ سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چسٹ بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس۔ پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپل۔ چھوٹی چھوٹی مگر تیز متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک، چھوٹے مگر گھونگریالے بال ــــــ ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔

میں عصمت پر عاشق نہیں ہوا۔ لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ــــــ عصمت سے صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔

"بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں۔"

ایک بزرگوار اہلِ قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں، جو بہت دیر تک عصمت کے پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ قرّیا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ سچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ نیلم کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"واقعی یہ بہن بنا نا کیا ہے ــــــ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے" اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں ــــــ دونوں کو خدا سمجھے ــــــ!

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن عصمت کا

پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے بہت گھبرائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اُسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی نحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں عصمت نے آخر میں جھلّا کر کہا:۔

"سُولی پر بھی چڑھا دیں لیکن حلق سے انا لحق ہی نکلے گا۔"

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ کر عدالت میں آتے رہے عصمت نے مجھ سے کہا۔

"منٹو بھائی! چودھری نذیر سے کہئے کہ وہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی آ جائے گا۔"

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا۔

"لاہور آپ لوگ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟"

عصمت نے جواب دیا۔ "جی نہیں، جوتے خریدنے گئے تھے۔"

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اُکسا رہی تھی۔

"صفیہ یہ لوگ اتنا روپیہ اُڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں ۔۔۔" دونوں

ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا، اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی، اُن کی بھاری بھر کم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں ہی میں ہم لوگوں کا حلیہ ناقابلِ شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ بسکی سے ہٹ اور رنگ پر مرکوز ہو گئی۔ "آؤ صفیہ ہم اُن کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے پیلے، سبز اور کالے رنگ کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اُس نے تارکول کا لیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اسکے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا۔ ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے انداز میں کہا۔

"آؤ! پری چہرہ کے گھر پر دھاوا بولیں۔"

ان دنوں نسیم بانو ہمارے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسبِ عادت پورے میک اپ میں تھی۔ اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اُس کا خاوند احسان ہمارا شور سُن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی کھُتنی سی لگتی تھی۔ میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "نسیم واقعی خوبصورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حسُن ہے لیکن بہت ٹھنڈا!"

عینک کے گرد آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بن گئی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں۔ "منٹو بھائی! جی چاہتا ہے

اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں" ـــــ یا ـــــ "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی"۔

چند مہینوں کی بات ہے۔ میں اور عصمت بمبئی ٹاکیز سے واپس الیکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا "کرشن چندر کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں ـــــ زنا بالجبر اور قوسِ قزح جسے وہ قوس و قزح لکھتا ہے"۔

عصمت نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "یہ تو ہے"۔

"سوچتا ہوں ایک مضمون لکھوں جس کا عنوان ہو "کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر ہو" میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا۔

"لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا نفسیاتی رشتہ کیا ہو سکتا ہے۔؟"

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "جمالیاتی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتہائی جاذبیت اور کشش ـــــ لیکن آپ تو کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے"۔

"جی ہاں" ـــــ سرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے۔ ضمنیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلاّد فلک سے منسوب کیا جاتا ہے ـــــ ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو ـــــ"

"ہو سکتا ہے ـــــ آپ یہ مضمون ضرور لکھئے ـــــ"

"لیکن عیسائیوں کے فنِ مصوری میں سرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے ..... نہیں نہیں" میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ پھوٹا "صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے معنون کیا گیا ہے۔ اور کنواری مریم کا لباس سرخ ہوتا ہے یہ عصمت کی نشانی ہے"۔

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا، وہ مسکرا دی۔

"منٹو بھائی! آپ یہ مضمون ضرور لکھئے، مزا آجائے گا ـــــ لیکن عنوان میں سے بالجبر اڑا دیجئے"۔

"کرشن کو اعتراض ہوگا، کیونکہ وہ جبر یہ فعل سمجھ کر ہی تو روتا ہے"۔

"بیکار روتا ہے، کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی ہیروئنوں کو اچھا لگا ہو"۔

"اللہ بہتر جانتا ہے"۔

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں۔ حق میں کم، خلاف میں زیادہ۔ کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکہ داروں نے ڈبیہ میں بند کر رکھا تھا۔ اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا۔ آدمی ذہین ہیں۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے۔ اس لئے مضمون کافی دلچسپ سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے، انشاء پردازوں کے ریڈ فرز اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں، عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انھیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا، گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔

جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور بوجھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلّی اور بنیادی جو انشاء پرداز عورتوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے ـــــ؟"

ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اسکی بنیاد پر

مُصنفین کو جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے ——— مرد یا عورت ؟ ——— کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلّی اور بنیادی زاویۂ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ" گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں" کھٹیٹ پطرسی فقرے بازی ہے۔ ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں، لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں لکچر دیتے ہیں تو طلباء اور طالبات سے اُن کا خطاب جُداگانہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب انھیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشو و نما پر غور کرنا پڑیگا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ اُن کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے۔ ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے، کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلّی اور بنیادی جو انشاء پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فنِ تعمیر کا جائزہ لیں گے۔ تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر لفظے میں موجود ہے جو اُس کو

سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ ہم مُصنّف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں :-

عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اُسے کسی مرد نے چاہا، اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دبا دو تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جھلستی لُو میں پنکھا جھلتا ہے۔ ہزاروں دیویوں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشّان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے۔ اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا ہے اور کپڑوں پر استری کرتا ہے۔ ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مُصنّفہ واقف نہیں۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے ——— مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنھوں نے پنج سالہ اسکیموں کے تحت تیار کیا ہے۔ اور اب وہ اُسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں ——— عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن اس عشق کے اے بی سی اور ڈی ہی دونوں کرنٹوں سے واقف تھی۔ لیکن پھر یہ ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اُسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے ناآشنا ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے۔ اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے۔ تو بہت ممکن ہے۔ ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے لیکن "تل"۔ "گیندا"۔ "بھول بھلیاں" اور "جال" تصنیف کرنیوالی عصمت یقیناً مر جائیگی۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اُسے پسند کرے گا، کوئی ناپسند، لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بُری بھلی، عُریاں، مستور جیسی بھی ہے، قائم رہنی چاہئے۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں، اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے۔